غلام عباس کی افسانہ نگاری

(خود اُن کی اور نقادوں کی نظر میں)

ڈاکٹر علمدار حسین بخاری

غلام عباس کی افسانہ نگاری کے تصورات و موضوعات کے بارے میں گفتگو کرنا بظاہر اس بات کا اعتراف لگتا ہے کہ غلام عباس افسانہ کسی جواب مضمون کی طرح موضوع سوچ کر لکھا کرتے تھے کیوں کہ کسی متعین 'موضوع اور نظریہ کے مباحث' متن پر مصنف کے اقتدار کے اثبات کا جواز محسوس ہوتے ہیں، یعنی مصنف کے پاس کوئی ایسا واضح موضوع، نظریہ یا پیغام ہوتا ہے، جسے وہ حسبِ منشاء دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ زبان کے واسطے (medium) سے اس کی تدوین اور رمز بندی (coding) کرتا ہے اور پھر اس کا سر بند اور سر بہ مہر پیغام (موضوع و نظریہ) پورا کا پورا قاری یا سامع تک پہنچ جاتا ہے اس نقطۂ نظر سے قاری/سامع کا کردار محض انفعالی، بلکہ ایک خالی برتن کا سا رہ جاتا ہے، جس میں مصنف کے تشکیل کردہ متن میں بھرے مواد میں سے کچھ (بصورتِ معنی) منتقل ہو جاتا ہے یعنی قاری/سامع، مصنف/متکلم کے متن یا کلام میں بھرے معنی کو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے انفعالی انداز میں جذب یا قبول کر لیتا ہے۔

سماج کی وسیع تر سطح پر بھی استعماریت، آمریت اور فسطائیت زعمِ اقتدار و اختیار میں عام انسان کو ایک خالی برتن ہی کی طرح سمجھتے ہیں، جس میں مقتدر طبقے اپنے من مانے معانی (نظریات، خیالات اور عقائد) بھر دینا چاہتے ہیں تا کہ وہ خود ان کی مرضی و منشا کے مطابق سوچیں اور عمل کریں اور اس طرح اچھی رعایا/غلام ثابت ہوں، ایک مصنف بھی جب کوئی ایسا ہی پہلے سے طے شدہ مقصد پیش نظر رکھتا ہے تو وہ کسی آمر، فاشسٹ (سیاسی، نظریاتی، مذہبی، نسلی، گروہی) یا استعماریت پسند (imperialist). کا روپ دھار لیتا ہے؛ وہ اپنے زیر تصنیف متن کو اپنی نظریاتی قوت اور اقتدار کے اظہار کا وسیلہ سمجھ لیتا ہے اور اپنی تحریر کے ذریعے اپنے من مانے تصورات و نظریات سے لوگوں کے ذہنوں اور جسموں کو مغلوب کر لینا چاہتا ہے، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ (اس کے قاری) خود اُس کی مرضی اور منشاء کے مطابق سوچنے اور عمل کرنے لگیں۔

جدید لسانی اور ادبی نظریہ ساز اس بات کو زبان کی سلطنت کے اصولوں سے ناواقفیت کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں، ان کے خیال میں "زبان ہی (استعمال کرنے والے کے معنی پر) اقتدار کو تہس نہس کرتی ہے اور متبادل آوازوں (یا قوتوں) کو آزاد کرتی ہے۔ زبان کا یہ کردار ادبی ڈسکورس میں مزید موثر اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ہماری ادبی تنقید کی روایت فن پارے کے موضوع اور معنویت کے واضح تعین کے جتن کرتی دکھائی دیتی ہے کیوں کہ وہ اسے ہی بڑا تنقیدی کارنامہ گردانتی ہے لیکن جدید توضیحی و سماجی لسانیات اور ڈسکورس کے مختلف نظریوں (theories) نے اس تنقیدی ماڈل کو لگ بھگ منہدم کر دیا ہے، فکشن کی تنقید

کے انداز میں انقلاب برپا ہو چکا ہے کیوں کہ متن کے موضوع اور معانی پر مصنف اور ناقد کے اقتدار کو اب تسلیم نہیں کیا جاتا؛ اُردو کے نئے اہلِ قلم میں یہ احساس پیدا ہو رہا ہے لیکن پرانے لوگوں میں غلام عباس اردو کے ان چند ادیبوں میں سے شمار ہوتے ہیں، جو اپنے تخلیقی متن کو قاری سوچ اور تفہیم پر خود اپنے اقتدار کے قیام کے حربے کے طور پر استعمال نہیں کرتے، بلکہ ان کا اصرار تو یہ ہے کہ

"۔۔۔اس سلسلے میں، میں بڑا خود غرض واقع ہوا ہوں، میں لوگوں کے لئے نہیں لکھتا۔ میں اپنے لئے لکھتا ہوں۔ میں نہ تو کسی مقصد کے تحت لکھتا ہوں اور نہ ہی بیرونی نظریات اور سیاست میرے پیشِ نظر ہوتی ہے، مجھے کبھی پروا نہیں ہوتی کہ میری کہانی مقبولیت حاصل کرتی ہے یا نہیں، میں صرف اپنے لئے لکھتا ہوں۔" ۱

۔۔۔تو کیا غلام عباس زندگی سے یکسر لاتعلق ادب برائے ادب کا داعی ہے؟ ان کے افسانوں کے مطالعے سے اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں ملتا؛ کیوں کہ ان میں تو ہم عصر انسانی زندگی اپنے متنوع اور بھرپور نقش اُبھارتی دکھائی دیتی ہے، تو پھر کیا غلام عباس نے محض شاعرانہ تعلّی سے کام لیا ہے؟ معاملہ دراصل یہ لگتا ہے کہ غلام عباس ایک تو موضوعات کے انتخاب میں خود اپنی تخلیقی آزادی برقرار رکھنا چاہتے ہیں، دوسرے وہ اپنے قاری کی آزادی کو بھی سلب نہیں کرنا چاہتے۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے عیاں ہوتا ہے کہ ان کے لئے تو افسانہ نگاری معنی خیزی کا ایک کھیل ہے اور یہ کھیل کھیلنا وہ خوب جانتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کردار/شخصیتیں نظریاتی کٹھ پتلیاں نہیں ہوتے بلکہ عام روزمرہ زندگی میں رہتے بستے انسانوں کی مانند بولتے چالتے اور عمل کرتے ہیں اس لئے قاری ان کے قول و عمل کے بارے میں دورانِ قرأت حتیٰ کہ افسانہ ختم کر لینے کے بعد بھی کوئی فوری اور حتمی رائے قائم نہیں کر پاتا؛ حتمی رائے جو موضوع کی مکمل تفہیم کے زعم سے پیدا ہوتی ہے۔

ادب میں یہ مسئلہ بہت اہم رہا ہے کہ ادب کا موضوع کیا ہوتا ہے یا کیا ہونا چاہیے؟ لیکن جب جدید نظریہ ساز ایک ادبی متن میں کسی مخصوص و متعین موضوع کے بارے میں ہی شبہات کا اظہار کر رہے ہوں، تو کیا کیا جائے؟ بعض نقادوں نے اس کا ایک اچھا حل نکالا ہے، وہ مرکزی خیال (theme) اور دعویٰ یا قضیہ (thesis) میں حدِ امتیاز قائم کرتے ہیں:

"--- The simple distinction here is that although both pose questions, a thesis also suggests or argues for answers. A theme, in contrast, can involve the establishing of a set of issues, problems, or questions without any attempt to satisfy the demands these make of the reader. ۲

مندرجہ بالا اقتباس میں مرکزی خیال اور قضیہ دونوں اگرچہ نئے سوالات اُبھارتے ہیں لیکن مرکزی خیال کچھ مخصوص معاملات، مسائل اور سوالات قائم کرتے ہوئے قاری سے ان کے مطالبات پورے کرنے کا تقاضا نہیں کرتا اور نہ ہی طے شدہ اور واضح جوابات دینے کی قاری کو ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

البتہ کسی ادب پارے کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کے ذہن کے اندر کئی ایسے دریچے کھلنے لگتے ہیں، جن سے قاری زندگی کے بارے میں، اور زندگی اور سماج کے ساتھ اپنے رشتوں کے بارے میں ایک نیا منظر نامہ دیکھنے کے قابل ہوسکتا ہے۔

غلام عباس کو کیوں کہ نظریاتی حوالے سے کسی قسم کا دعویٰ ہی نہیں، اس لئے ان کے افسانوں میں قضیوں (thesis) کی بجائے موضوعات (Themes) کے تنوع کو دیکھا جا سکتا ہے، ان کے ہاں ترقی پسندوں یا دیگر ''نظریاتی'' ادیبوں کی سی استخراجیت (deduction) نہیں ملتی اور ان کا افسانہ کم از کم نظریاتی سطح پر مصنف کے کسی پہلے سے طے شدہ حل کی طرف نہیں بڑھتا بلکہ وہ قاری کے لئے معنی خیزی کے امکانات کے در وا کرتا ہے، اس لئے ان کے افسانے پڑھتے ہوئے قاری کا ذہن بیک وقت افسانے اور زندگی کے کئی معنوی امکانات کو جذب کرتا چلا جاتا ہے۔ ان کے معروف افسانے ''آنندی'' ہی کو دیکھیئے جو ایک شہر کی تعمیر کا منظر نامہ بھی ہے، شہروں کے بسنے کے بارے میں ایک تاریخی و تہذیبی تصور کا اشاریہ بھی، انسان کی ازلی گناہ کے ساتھ کشاکش، نیکی اور بدی کی قوتوں کے جدل مسلسل اور صالحین کے زعم پارسائی اور اصلاح پر طنز بھی محسوس ہوتا ہے، یہی نہیں بلکہ افسانے کے مختلف حصے، کردار اور دیگر اشارات (میونسپلٹی کے مختلف ممبروں کی تقریریں، بیسواؤں کی شہر بدری، پرانی بستی کے کھنڈروں میں مسجد کے آثار، ٹوٹا پھوٹا مزار اور پیر کڑک شاہ کا ملنگ، کبابی، بساطی، درزی، نائی کی دکانیں، بیسواؤں کے گھروں کے برآمدوں کے اوپر سنگِ مرمر کے مور وغیرہ) اپنی اپنی متنوع معنویت کی طرف اشارہ کرتے محسوس ہوتے ہیں مختلف اوقات میں ان میں سے ہر ایک واقعہ، کردار یا منظر پر خاص توجہ مرکوز کرنے سے افسانے کی توضیح کے انداز بدل جاتے ہیں اور ان کی ردِ تشکیل قاری کے لئے ان گنت بصیرتوں کو ممکن بنا سکتی ہے۔ اسی طرح ''حمام میں'' کی ''فرخ بھابی'' اور دوسرے کردار اور ان سب کے طرز ہائے عمل معاشرتی زندگی کے ایسے رنگارنگ پہلوؤں کو اجاگر کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ جن میں سے کسی ایک پہلو یا بعض پہلوؤں پر خاص توجہ افسانے کی توضیحات کے متنوع امکانات پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح غلام عباس کی فنی معروضیت اور غیر وابستگی اسے معاشرتی معاملات کے ہنگام سے بے دخل نہیں کرتی، بلکہ زندگی کے ساتھ اس کے تعلق کو اور زیادہ گہرا وسیع تر اور با معنی بناتی ہے۔

فکشن کے ایک نظریہ ساز نقاد وائن سی بوتھ (Wayne C.Booth) نے جدید فن افسانہ نگاری پر اپنی وقیع اور بصیرت افروز کتاب "The Rhetoric of Fiction" میں جدید فکشن کے مطالعے میں مصنف اور قاری دونوں کی مفروضہ 'معروضیت اور غیر جانبداری' کے دعوے یا مفروضے کی بھرپور دلائل کے ساتھ تکذیب کی ہے، فکشن کے بارے میں ہونے والی ہماری ادبی تنقید کی عمومی بحث کئی حوالوں سے گمراہ کن لگتی ہے کیوں کہ اس ساری بحث میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شخص ہر دوسرے شخص کے تعصبات کے خلاف اور خود اپنی تشکیل کردہ صداقت کے ساتھ خود اپنی وابستگیوں (commitments) کے حق میں سرگرم گفتار ہے، خود ہم بھی اسی افسانہ نگار کو پسند کرتے ہیں، جو کسی نہ کسی طور خود ہمارے تصور و جذبۂ صدق و راستی کے مطابق لکھ رہا ہو اور یہ ہم جانتے ہیں کہ ایک پرشور انفرادی 'جذبہ' کسی بھی طور کم متعصبانہ نہیں ہوتا، ہاں افسانہ

نگار سے یہ تقاضا ضرور ہونا چاہیے کہ وہ اپنے تعصبات کو بغیر کسی ماہیت قلبی کے براہ راست قاری پر نہ ٹھونسے۔ افسانہ نگار کوئی کردار تخلیق کرتے ہوئے سیدھے سادے انداز میں ایک ایسا مثالی غیر شخصی ''عمومی انسان'' ہی تخلیق نہیں کررہا ہوتا، جو انسان کی تمام مجرد صفات کا مجموعہ ہو بلکہ وہ تو خود اپنی ذات کی ایک صورتِ نو تخلیق کرتا ہے، جو دوسرے افسانوں کے مفروضہ انسانوں سے بہت مختلف ہوتی ہے، بعض افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کے بارے میں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ لکھتے ہوئے اپنی تحریر میں شعوری طور پر خود اپنا آپ منکشف یا تخلیق کررہے ہیں۔ تصنیف کے اندر مصنف کی شخصیت کے اس تصور کو مختلف اہل نقد نے متن کے اندر متن کا مفروضہ مصنف (implied author) سرکاری محرر (official scribe) اور انائے دوم (second self) وغیرہ کہا ہے۔ بوتھ کا کہنا ہے کہ:

"---- it is clear that the picture the reader gets of this presence is one of the authors most important effects. However impersonal he may try to be, his reader will inevitably construct a picture of the official scribe who writes in this manner and of course that official scribe will never be neutral towards all values. [۳]

یہی نہیں کہ ''قاری تحریر سے مصنف کی موجودگی کے تصور سے اس کی جو تصویر بناتا ہے، وہی مصنف کے اہم ترین اثرات میں سے ایک ہے؛ مصنف اپنی تحریر میں جتنا بھی غیر شخصی انداز اپنائے اس کا قاری بہرحال اس کے سرکاری/دفتری محرر کی ایک تصویر ضرور بنائے گا، جو کہ اس کے مخصوص انداز میں لکھتا ہے اور قاری یہ جان لیتا ہے کہ (بعض مخصوص سماجی) اقدار کے بارے میں یہ سرکاری/دفتری محرر کسی بھی طرح غیر جانبدار نہیں ہے۔'' مسئلہ یہ بھی ہے کہ خود قاری کی اپنی ذات اور سوانح عمری، اس کا مطالعہ، اس کا نظامِ اقدار اور اس کا اندازِ فکر وغیرہ بھی تخلیق کی تفہیم و توضیح کے عمل پر مثبت یا منفی انداز میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہر قاری خود اپنے ذاتی اور سماجی پس منظر ہی میں کسی متن سے معنی اخذ/پیدا کرتا ہے، جو کسی بھی دوسرے قاری سے یکسر یا کسی حد تک مختلف ہوتے ہیں اس لئے نہ صرف ہر قاری کی قرأت متن کی نئی معنوی تشکیل کرتی ہے بلکہ ایک ہی قاری مختلف اوقات اور مختلف ماحول میں ایک ہی متن کی قرأت میں خود اپنے اخذ کردہ معانی میں نئی نئی توسیعات کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

بوتھ کا خیال ہے کہ افسانے میں مصنف کی انائے دوم (second self) یا مفروضہ مصنف (implied author) اپنے اسلوب (style) لہجے (tone) اور تکنیک کے ذریعے بھی اپنی پس پردہ خواہشات، ترجیحات اور خواہشِ اقدار کو منکشف کرتا ہے۔ فکشن میں فن خطابت و ترغیب پس پردہ رہ کر اس کی سب سے اہم خصوصیت بن جاتے ہیں، لیکن بوتھ کی تنقیدی بصیرت اسے افسانے کے اندر معانی کے متنوع کھیل کا منظر بھی دکھاتی ہے، اس لئے وہ کسی ایسے متعین اور جامد معنی کو تسلیم نہیں کرتا، جنھیں مصنف اپنی پوشیدہ خطابت کے ذریعے قاری تک پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ افسانے کے مفروضہ مصنف، اس

کے راوی اور اس کے مختلف کرداروں کی زندگی کے بارے میں اپنی اپنی فہم ہوتی ہے جو ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، حتیٰ کہ ایک کی تفہیم بعض اوقات دوسرے کی تفہیم سے ٹکرا جاتی ہے، کیوں کہ:

"----most works worth reading have so many possible "themes", so many possible mythological or metaphorical or symbolic analogues, that to find any one of them, and to announce it as what the work is for, is to do at best a very small part of the critical work. [۴]

'اکثر قابل مطالعہ تحریروں کے اتنے زیادہ امکانی ''موضوعات'' ان کی اتنی زیادہ اساطیری یا استعاراتی یا علامتی مشابہتیں ہوتی ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو تلاش کر کے یہ اعلان کرنا کہ اس فن پارے کا اصل موضوع یہ تھا، تنقیدی ذمہ داری کا انتہائی معمولی حصہ ادا کرنا ہے'؛ ایک باشعور قاری یا نقاد کی ذمہ داری اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے، اُسے متن خاص طور پر ادبی متن میں معنی کی گریز پائی کا سامنا ہوتا ہے کیوں کہ متن میں معنی کا کوئی واضح مرکز یا ماخذ تلاش کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ جدید ردِ تشکیلیوں (deconstructionist) نے معانی کی اسی لامرکزیت پر زور دیا ہے اور ان کے ہاں متن کے مضافات (periphry) اور مرکز (center) کے مابین متضاد اور متناقض رشتوں کی دریافت کا عمل ایک انتھک فکری و معنوی جستجو میں بدلتا دکھائی دیتا ہے، ایسے میں غلام عباس کے یہ بیانات لائق توجہ ہیں:

''---میں کسی کمیونسٹ پارٹی کی ترویج کے لئے نہیں لکھتا، میں اپنے لئے لکھتا ہوں میری کہانیاں پروپیگنڈہ نہیں ہوتیں، جس طرح کرشن چندر مسلسل مزدور کا رونا روتا ہے، میری کہانیوں میں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔ میری ہر کہانی اپنا الگ الگ مقصد رکھتی ہے--- میں نے خود کو کبھی بھی کسی سیاسی گروہ سے منسلک نہیں کیا، میں ہمیشہ آزاد رہا ہوں۔'' [۵]

''---ادب میں کوئی مجبوری نہیں ہونی چاہیے اور نہ کچھ زبردستی کا ٹھونسا ہوا ہونا چاہیے۔ وہ ادب نہیں ہوتا، سیاست ہوتی ہے۔'' [۶]

''میں آرڈر پر نہیں لکھتا، اس سلسلے میں میں بڑا خودغرض واقع ہوا ہوں، میں لوگوں کے لئے نہیں لکھتا، میں اپنے لئے لکھتا ہوں، میں نہ تو کسی مقصد کے تحت لکھتا ہوں اور نہ ہی بیرونی نظریات اور سیاست میرے پیش نظر ہوتی ہے۔ مجھے کبھی پروا نہیں ہوتی کہ میری کہانی مقبولیت حاصل کرتی ہے یا نہیں، میں صرف اپنے لئے لکھتا ہوں۔ [۷]

''میں کسی فرمائش یا ہدایت کے مطابق ادب تخلیق کرنے کا قائل نہیں، خواہ وہ کسی بھی قسم کی انتظامیہ ہو۔ ادیب سے کسی خاص قسم کا ادب تخلیق کرنے کی فرمائش کرنا، سخت قابل اعتراض ہے--- پیسے کے حصول کے لئے لکھنا یا کسی پروپیگنڈے کی غرض سے لکھنا خالص ادب نہیں ہوتا--- مجھ سے کئی دفعہ فرمائش کی گئی کہ میں ایسا افسانہ لکھوں، جس میں پاکستان

کی جھلک ہو، میں نے انکار کر دیا ۔۔۔ ادب جتنا یونیورسل ہو، اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔" ۸

"ترقی پسند تحریک سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔ میں سمجھتا تھا کہ ادب کو پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کرنا غلط ہے، کسی سیاسی نقطۂ نظر کو ادب یا ڈرامے کے ذریعے پھیلایا جائے تو میں اسے ادب نہیں سمجھتا۔ ترقی پسند تحریک دراصل کمیونسٹ تحریک تھی۔ ۹

"اگر میں کسی افسانے میں کسی مسئلے کو وضاحت کے ساتھ پیش کر سکوں، تو میں اسے بڑی کامیابی سمجھتا ہوں، لیکن بدقسمتی سے پڑھنے والے بلکہ بعض اوقات نقاد بھی مجھ سے اس کے حل کی بھی توقع کرنے لگتے ہیں اور یوں وہ ایک فن کار اور ایک مصلح کی شخصیتوں کو گڈمڈ کر دیتے ہیں۔" ۱۰

"غلام عباس اپنی عمر کے آخری حصے میں فن افسانہ نگاری پر ایک کتاب لکھ رہے تھے، جو نہ مکمل ہو سکی اور نہ ہی اس کا کوئی مسودہ ہی سامنے آیا، کئی انٹرویوز میں اس متصورہ کتاب "ایک نوعمر افسانہ نگار کے نام" کا انہوں نے شدومد سے ذکر کیا، اس کا ایک اہم نکتہ یہ تھا کہ "کسی جماعت کے سلوگن کے تحت نہ لکھیے۔" ۱۱

خود اپنے فن کے بارے میں غلام عباس کے یہ دعوے یا مفروضات بلا جواز نہیں کیوں کہ اس کے سنجیدہ قاری اس کے افسانوں میں کوئی طے شدہ اور مرکوز نقطۂ نظر تلاش نہیں کر پاتے ایسا واضح نقطۂ نظر جو مصنف کی کسی واضح ترجیح یا اس کے کسی تعصب کی طرف اشارہ نما ہو۔ غلام عباس کے فن کے نقادوں نے بھی اس کی فنی غیر جانبداری ہی کا عام طور پر اقرار کیا ہے، چند اہم نقادوں کی آراء حسب ذیل ہیں:

"۔۔۔ غلام عباس کو کسی چیز کا سودا نہیں، نہ کسی خاص موضوع کا، نہ کسی خاص اسلوب کا، نہ کسی خاص جذباتی فضا کا، یہی ان کی کمزوری بھی ہے اور یہی ان کی قوت بھی۔" ۱۲

"غلام عباس کے افسانے، افسانے ہی ہوتے ہیں، وہ کسی نظریہ یا میلان کے چکر میں پھنس کر فن کے اوصافِ حمیدہ سے ہاتھ نہیں دھو بیٹھتے۔" ۱۳

"ہمارے اکثر افسانہ نگاروں کا فن احتجاج کی پیداوار ہے۔ اس جذبے کی بدولت ان کے افسانوں میں درشتی آ گئی ہے۔ غلام عباس کے افسانے ان سے بہت کچھ مختلف ہیں۔ ان کا فن نرم اور سبک سیر ہے۔ وہ سیاسی، اقتصادی یا معاشرتی خرابیوں کے خلاف صدا بلند نہیں کرتے، وہ زندگی کے دھارے کے ساتھ ساتھ چلنے کے قائل ہیں۔ وہ سیاسی لیڈر، اقتصادی ماہر یا مصلح نہیں اور نہ انہیں اخلاقیات اور فلسفے کا زعم ہے۔ بقول راشد: چھوٹے آدمی کے داستان گو ہیں۔" ۱۴

"منافقانہ صورتِ حال کا شعور دوسرے حقیقت نگاروں کی طرح غلام عباس کے ہاں پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتا۔ وہ نہ تو اصلاح چاہتے ہیں اور نہ انقلاب۔ وہ انکشاف پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور یہی ان کا مقصد ہے۔" ۱۵

"غلام عباس خود ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور غریبوں کے درمیان

زندگی بسر کی تھی ---ان کے تمام افسانے زندگی کے حقائق اور گہرے مشاہدے پر مبنی ہیں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کے کسی افسانے میں پروپیگنڈہ کا معمولی سا عنصر بھی شامل نہیں ہے، حالانکہ انھوں نے جب لکھنا شروع کیا وہ پریم چند کی اصلاح پسندی اور ترقی پسند تحریک کا نہایت ہیجان خیز دور تھا۔'انگارے' کی اشاعت نے تہلکہ مچار کھا تھا اور ہر جانب بغاوت اور سرکشی کا نعرہ گونج رہا تھا۔''۱۶؎

''ان افسانوں کو پڑھتے وقت بے ساختہ جین آسٹن کی بے مثال کردار نگاری کا خیال آتا ہے، جو لاتعلقی اور ذاتی جذبات سے مکمل بے نیازی کی بناء پر بلا کی بے غرض، پُر خلوص اور واقعیت و حقیقت سے نزدیک ہو گئی ہے۔''۱۷؎

''غلام عباس ہمارے بہت سے جانے بوجھے افسانہ نگاروں سے بے حد مختلف ہے، اس کا فن نرم رو اور سبک سیر ہے۔ وہ منٹو کی طرح زندگی کے بخیے نہیں ادھیڑتا، وہ عسکری کی طرح کم عمری میں بالغ ہو جانے والے بچے کی طرح چھپے روزنوں میں سے زندگی کو نیم برہنہ نہیں دیکھتا۔ وہ عزیز احمد کی طرح ناکام مصلح بن کر کسی فاسد انا کی تسکین بھی نہیں کرتا۔''۱۸؎

دلچسپ بات یہ ہے کہ اوپر دی گئی تمام آراء کے باوجود غلام عباس شاید اپنے ہم عصر ترقی پسند افسانہ نگاروں کی ضد میں فن برائے فن کے داعی بھی نہیں اور خود اپنے آپ کو ایسا ادیب بھی نہیں کہلوانا چاہتے کہ جس کے فن کا کوئی مقصد ہی نہ ہو۔ کیوں کہ ادب کی بے مقصدیت اس کے دور میں ایک تہمت سے کم نہیں تھی اس لئے انہوں نے اپنے افسانے کے موضوع اور مقصد کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے اپنے کئی انٹرویوز میں بعض اوقات ایسی باتیں کہیں جن میں اپنی تحریروں کے مقاصد کو واضح کرنے کی کوشش کی اور جن سے ادب کے بارے میں ان کے مؤقف کی جانبداری کا صریح اظہار بھی ہوتا ہے۔ اس نے یہ دعوے بھی کیئے کہ:

''میری ہر کہانی با مقصد ہوتی ہے، بغیر مقصد کے تو کہانی لکھی ہی نہیں جا سکتی---''۱۹؎

''میری ہر کہانی میں انسانی ہمدردی کا واضح عنصر موجود ہے۔ ادب تو بغیر مقصد کے ادب ہی نہیں کہلاتا، لیکن مقصد چننا میرا آزاد فعل ہے اور یہ بھی درست ہے کہ کوئی کہانی سیاست سے عاری نہیں ہو سکتی، میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ میں نے خود کو کبھی کسی سیاسی گروہ سے منسلک نہیں کیا۔''۲۰؎

''میری چیزیں ترقی پسندانہ ہیں، لیکن میں نے لیبل لگانا پسند نہیں کیا۔''۲۱؎

غلام عباس کے فن کے نقادوں نے بھی ان کے افسانوں کی جو توضیحات کی ہیں، ان میں آراء کے تناقضات و تضادات سے قطع نظر افسانوں میں سماج اور اس کی اقدار کے حوالے سے غلام عباس کے مؤقف کی جانبداری بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ چند نمائندہ نقادوں کی چند آراء ملاحظہ کیجئے:

''--- مجموعی حیثیت سے غلام عباس کے افسانے ایک مرکزی وحدت سے ایسے خالی

نہیں ہیں، جیسے پڑھنے والے کو محسوس ہوتے ہیں، البتہ یہ وحدت ذرا دیر میں ہاتھ آتی ہے، جہاں غلام عباس کا ایک منفرد لب ولہجہ، ایک منفرد انداز بیان اور ایک منفرد وضعی احساس ہے، وہاں ان کے احساسات کی بھی ایک علیحدہ سمت ہے۔"۲۲

"وہ (غلام عباس) معاشرے میں تصنّع، منافقت اور غیر عقلی طرز فکر کا کھلا اور غیر مشروط دشمن ہے۔ وہ جب اپنے افسانوں میں معاشرے اور معاشرتی کرداروں کے چہروں پر سے غازے دھوتا اور روغن کھرچتا ہے اور ان کے باطن کا کھوکھلا پن دکھاتا ہے، تو اس طرح وہ منفیت اور بے معنویت کے خلاف احتجاج کر رہا ہوتا ہے اور معاشرے میں انصاف کے لئے اور انسان کے اندر خیر کی قوتوں کو بیدار کرنے کے لئے پکار رہا ہوتا ہے۔"۲۳

"ان میں (غلام عباس کے افسانوں) ہم غلام عباس سے قطعاً ملتے ہی نہیں۔ یہاں ہماری ملاقات ٹھیٹھ انسانی کردار سے ہوتی ہے، جو ایک مخصوص معاشرے کی پیداوار اور اس کی پابندیوں کا شکار ہے--- غلام عباس کی نشتریت اور معاشرے پر ان کی شدید طنز ان میں بھی کارفرما ہے--- اتنی کہ "جزیرۂ سخنوراں" کی طرح ان کی "مقصدیت" جھلک اٹھتی ہے۔"۲۴

"---انھی (افسانوی کرداروں) کی مدد سے وہ انسانی دنیا کی چھوٹی بڑی کوتاہیوں پر ہنستا ہے، انھی کے اعمال سے غلام عباس اپنا یہ بنیادی تصور ہم پر واضح کرنا چاہتا ہے کہ انسان کی دنیا میں کوئی چیز اور کوئی قدر مستقل نہیں۔ انسان ہمیشہ سے دوسرے انسانوں کی حیلہ سازیوں کے سامنے بے بس چلا آ رہا ہے اور ان حیلہ سازیوں سے محفوظ رہنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ انسان، شر کو بھی خیر کے پہلو بہ پہلو جگہ دے، تاکہ دونوں کے آہنگ سے دنیا زیادہ خوبصورت اور زیادہ رنگین ہوتی چلی جائے۔"۲۵

"غلام عباس کے افسانے موضوع کے اعتبار سے بظاہر الگ الگ اور تتر بتر چیزیں نظر آتے ہیں، لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایسے بے ترتیب نہیں ہیں۔ انھوں نے زندگی کو طنز اور فریب سمجھا ہے۔ زندگی کے ہر پہلو میں وہ ایک چھپی ہوئی طنز دیکھتے ہیں، اسی طنز کو ابھار کر نمایاں کر دیتے ہیں۔"۲۶

"غلام عباس نے تجزیاتی انداز اپنا کر فرقہ ورانہ فسادات کی جڑیں مذہبی بالادستی کے جذبے میں نہیں، بلکہ اقتصادی بالادستی کے جنون میں پیوست دیکھیں، "اوتار" میں ہر ہندو مسلم فساد کا محرک کمزور قوم کی جائیداد، املاک اور وسائل پر قبضہ کرنے کی ہوس ہے، چنانچہ غلام عباس مجنونانہ فرقہ واریت کے زہر کا تریاق مذہب سے انکار میں نہیں، بلکہ سچی مذہبیت میں ڈھونڈتے ہیں، یوں غلام عباس کا فن زندگی کی بے لاگ ترجمانی تک محدود رہنے کی بجائے زندگی کو بدلنے کا تمنائی بن جاتا ہے۔"۲۷

''غلام عباس متعدد امور میں اپنے بہتیرے معاصرین سے خواہ جتنا بھی مختلف ہو، بُرے بھلے عقیدے یا تصور یا نظریے سے اسے یکسر خالی الذہن قرار نہیں دیا جاسکتا--- درحقیقت راشد اور عباس دونوں کے دونوں خیر وشر کا ایک اور تصور رکھتے ہیں، جو ان کا اپنا تصور بھی نہیں، بلکہ لبرل ازم کا وہ تصور ہے جس کی رو سے ہر فرد اجتماعی نظم وضبط سے آزاد ہوتا ہے۔ خیر اس کے نزدیک وہ ہوتا ہے، جو اس کی آزاد خیالی اور آزادہ روی کی تائید کرتا ہو اور شر وہ ہوتا ہے جو آزادی مطلق کی تردید یا تحدید کرتا ہو۔'' ۲۸

''ہمارے جدید افسانے میں انسان کی بنیادی خباثت کا ذکر تو بہت ہوا اور یہ کوئی قابل اعتراض بات بھی نہیں، کیوں کہ زندگی نہ فقط خباثت ہے نہ صرف معصومیت، لیکن جدید اردو افسانہ نگاروں میں شاید عباس ہی کے ہاں انسان کی معصومیت کا شدید احساس ملتا ہے۔'' ۲۹

''غلام عباس--- طنز نہیں کرتے۔ ان کے افسانوں کی روح میں اترا جائے، تو وہ زہریلے بن جاتے ہیں، وہ اپنے ذہین قارئین کی زندگیوں میں زہر گھولتے ہیں۔'' ۳۰

غلام عباس کے خود اپنے مختلف بیانات اور تحریروں سے ان کا افسانے کے بارے میں جو موقف سامنے آتا ہے، اسے درج ذیل نکات میں ترتیب دیا جاسکتا ہے:

۱۔ غلام عباس افسانے کو انسانی اور سماجی حقیقت کا تخلیقی اظہار سمجھتے ہیں۔

۲۔ ان کے نزدیک افسانہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کے بارے میں اپنے ہی مشاہدے پر انحصار کرے اور کسی بنے بنائے فارمولے کو اپنانے سے احتراز کرے۔

۳۔ افسانہ نگار اپنے ذاتی تجربے اور ہڈ ورتی کو افسانے میں سمونے کا ہنر اور سلیقہ بھی جانتا ہو۔

۴۔ وہ یہ بات ذہن میں رکھے کہ انسان فطرتاً اچھا یا بُرا نہیں ہوتا، بلکہ معاشرہ اور ماحول اس کی شخصیت کی واقعی ساخت کو تشکیل کرتے ہیں۔

۵۔ افسانہ نگاری بے مقصد عمل نہیں ہے، بلکہ ''بغیر کسی مقصد کے تو کہانی لکھی ہی نہیں جاسکتی۔''

۶۔ لیکن افسانے کا مقصد خود اس کے اندر ہی پنہاں ہوتا ہے، افسانے کی دنیا سے باہر اسے تلاش کرنا ایک کارِ رائگاں ہے۔

۷۔ افسانہ نگار کا مطمحِ نظر ایک نئی (افسانوی) دنیا کی تخلیق ہوتا ہے، کسی پہلے سے موجود (حقیقی) دنیا کی اصلاح کرنا یا اس میں تبدیلی لانا نہیں۔

۸۔ افسانہ نگار کی تخلیق کردہ افسانوی دنیا، حقیقی انسانی معاشرت کی دنیا کے بالمقابل آ کر اس کے بارے میں ایک تنقیدی بصیرت پیدا کرتی ہے؛ حقیقی دنیا اور انسانی معاشرت کی براہ راست خوبیاں اور خامیاں بیان کرنا اس کا منصب نہیں ہوتا۔

۹۔ افسانہ، واقعی انسانی وسماجی حقیقت کا اظہار ہونے کے باوجود ہوتا افسانہ ہی ہے یوں اس میں سب سے اہم چیز اس کی افسانویت کو قرار دیا جاسکتا ہے۔

۱۰۔ اس لئے افسانہ نگار کو ترقی پسندوں کی طرح کسی سیاسی وسماجی منشور کا پابند نہیں بنایا جاسکتا۔

۱۱۔ کسی سیاسی گروہ سے ناوابستگی سے مراد سیاسی شعور کی عدم موجودگی نہیں ہے، نہ کوئی کہانی سیاست سے کلیتاً عاری ہو سکتی ہے۔

اسی طرح غلام عباس کے نقادوں نے ان کے فن کے بارے میں جو بحثیں اٹھائی ہیں، یا اپنے اپنے نقطۂ نظر سے جو جو توضیحات کی ہیں ان میں زیادہ تر درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ غلام عباس اپنے عصر کی سیاسی اور ادبی ہنگامہ آرائی اور گروہ بندی سے الگ رہے۔

۲۔ انھوں نے کبھی اپنے آپ کو کسی مخصوص موضوع، اسلوب یا جذباتی فضا کا پابند نہیں بنایا۔

۳۔ وہ نظریے یا میلان اور خیال پر فن کو ترجیح دیتے ہیں۔

۴۔ ان کے افسانوں کے کرداروں میں احتجاج یا جدل آزمائی کی بجائے سلامت روی، بلکہ سمجھوتہ بازی کا رجحان غالب دکھائی دیتا ہے۔

۵۔ وہ اپنے فن میں کسی تبدیلی، انقلاب یا اصلاح کی جہت نمائی نہیں کرتے بلکہ ہر قسم کی تبلیغ اور پروپیگنڈے کے سخت مخالف ہیں۔

۶۔ وہ غیر جذباتی انداز میں اور انتہائی غیر جانبداری سے اپنے زیر مشاہدہ حقائق کی فنی عکاسی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۷۔ ان کے افسانوں کی تعداد کم، لیکن موضوعات میں تنوع ہے۔

۸۔ غلام عباس ایک آزاد خیال افسانہ نگار ہیں اور یورپ کی آزاد خیال انسان دوستی کی تحریک سے متاثر ہیں۔

۹۔ غلام عباس اپنے افسانوں میں منافقت، بہروپ، ریاکاری کو منکشف کرتے ہوئے منفیت اور بے معنویت کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور اس طرح خیر کی قوتوں کے حق میں اپنی جانبداری ظاہر کر دیتے ہیں یہی چیز ان کے ہاں ایک پوشیدہ طنز کا بے تریاق زہر پیدا کرتی ہے۔

۱۰۔ غلام عباس کے افسانوں میں موضوعاتی و تکنیکی تنوع اور عدم وابستگی کے باوجود ایک 'وحدت' موجود ہے۔ ان کے "احساسات کی بھی ایک علیحدہ سمت ہے"

۱۱۔ ان کی غیر جانبداری اور عدم وابستگی کے پس پردہ ایک گہری مقصدیت موجود رہتی ہے اور یوں ان کا فن زندگی

کی بے لاگ ترجمانی تک محدود رہنے کی بجائے زندگی کو بدلنے کا تمنائی بن جاتا ہے۔

۱۲۔ کسی سیاسی مسلک کا اقرار نہ کرنے کے باوجود ان کے افسانے اپنے موضوعات کے اعتبار سے انھیں ایک ترقی پسند افسانہ نگار ثابت کرتے ہیں۔

افسانے کے بارے میں غلام عباس کے فنی مؤقف کے بارے میں مذکورہ بالا یہ چند نکات ان کی اپنی تنقیدی تحریروں، انٹرویوز، تبصروں اور ان کے اپنے افسانوں کی روشنی میں اخذ و مرتب کئے گئے ہیں۔ اسی طرح غلام عباس کے فن کے نقادوں کی آراء اور توضیحات سے اخذ کردہ چند نکات اس حوالے

سے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ ان سب باتوں کے پیش نظر نہ تو غلام عباس کی افسانوی حقیقت نگاری ترقی پسندوں کی نظریہ بند حقیقت نگاری ہے اور نہ ہی 'ستاں دال' کے لفظوں میں معاشرے کے چوک میں نصب شدہ کوئی 'آئینہ' ہے کہ جس میں معاشرتی منظر نامہ بغیر کسی ترمیم و تنسیخ کے عکس پذیر ہو رہا ہو، بلکہ ان کی افسانوی ہئیت ''ایک تخلیقی بشارت ہے--- جو روز مرہ تسلیم شدہ حقیقت سے رہائی'' ۳۱ کا عہد نامہ ہے۔ ''آنندی''، ''کتبہ''، ''اوورکوٹ'' اور اپنے دوسرے کئی افسانوں کا جو تخلیقی پس منظر غلام عباس نے خود بیان کیا ہے، اس کے مطابق یہ افسانے کسی واقعاتی حقیقت کا بیان نہیں، بلکہ اس سے محض تحریک حاصل کر کے ایک بالکل نئی اور اصل سے کہیں مکمل حقیقت کی فنی تعمیر ہیں۔ اسی باعث انتظار حسین نے کہا تھا کہ غلام عباس کا فن ''ایک معمار کا فن ہے''۔ ۳۲ خود غلام عباس کو بھی اس بات کا واضح ادراک حاصل تھا، اس لئے انھوں نے اپنے افسانے آنندی کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس افسانے کے مرکزی خیال نے ان کے ایک عام مشاہدے سے جنم لیا تھا۔ دہلی میں چاوڑی بازار کی طوائفوں کو اس بازار سے کچھ فاصلے پر ایک سنسان سی جگہ پر اپنے نئے گھر بنانے کے لئے کچھ زمین الاٹ ہوئی، یہ جگہ غلام عباس کے گھر اور دفتر کے راستے میں پڑتی تھی، اس لئے انھوں نے روزانہ یہاں سے گزرتے ہوئے ان مکانوں کو روز بروز تعمیر ہوتے دیکھا، بس یہ ان کا مشاہدہ تھا۔ بقول غلام عباس

> ''صناع کو زندگی سے جو مواد حاصل ہوتا ہے، اسے وہ اپنی تخلیق میں جوں کا توں استعمال نہیں کرتا، بلکہ اپنے فہم و ادراک کے مطابق اس میں حذف و اضافہ کرتا، اپنی قوت تخلیق سے اسے نیا جامہ پہنا تا اور حقیقت سے کہیں زیادہ موثر اور خوبصورت بنا دیتا ہے۔ اس قطع و بُرید اور انداز فکر سے صناع کی فن کارانہ صلاحیت اجاگر ہوتی ہے۔'' ۳۳

غلام عباس کے لئے افسانہ نگاری کسی مادی اور سماجی حقیقت کی عکاسی محض نہیں، بلکہ صناعی ہے۔ اس طرح غلام عباس کے بارے میں فکشن میں ایک معروضی حقیقت نگار کے طور پر قائم شدہ وہ اسطور بکھر جاتی ہے، جس کے دھندلے ہالے نے اب تک غلام عباس کی فنی شخصیت کو گھیر رکھا تھا اور اب ہم ان کے فن کو پرانی افسانوی بوطیقا سے ہٹ کر بھی دیکھ سکتے ہیں اور یوں ممکن ہے کہ کچھ نئی بصیرتوں کی جھلکیاں (traces) ہماری گرفت میں آجائیں، جدید مختصر افسانہ مغرب سے آکر ہمارے ادب کا حصہ بنا اس لئے ہم اسے بیانیہ فکشن کی نئی مغربی بوطیقا / شعریات سے الگ تھلگ رہ کر نہیں دیکھ سکتے جس نے ہئیت پسندی (formalism) ساختیات پسندی (Structuralism) بیانیات (Narratalogy) پس ساختیات اور پس جدیدیت پسندی کے متنوع رجحانات اور نظریات (theories) کے علاوہ جدید توضیحی لسانیات اور تجزیہ کلام (Discorus Analysis) وغیرہ کے اکتشافات اور بصیرتوں سے کام لے کر فکشن کی تفہیم اور توضیح کے انداز یکسر بدل دیئے ہیں لیکن ہماری تنقید ابھی تک عموماً افسانے کے مخصوص اور واضح موضوع اور کرداروں کی نفسیات کی موشگافیوں سے آگے نہیں بڑھی جو زیادہ تر غیر جانبداری کا بھرم رکھنے کی کوشش کرنے کی بجائے خود نقاد کے نجی تاثرات اور من پسند یا مروجہ توضیحات پر مشتمل ہوتی ہے۔ غلام عباس اُردو کے ان چند افسانہ نگاروں میں سے ہے جسے اُردو افسانہ نگاری کے رائج زمروں (حقیقت پسند، ترقی پسند،

نفسیاتی یا علامتیت پسند افسانہ نگار وغیرہ) میں سے کسی میں رکھا نہیں جا سکتا اس لئے اس کی افسانہ نگاری پر تنقید لکھنا اور دوٹوک رائے قائم کرنا آسان نہیں، غلام عباس کے افسانوں میں کوئی وحدت تلاش کرنے کے لئے حسن عسکری کی سی بصیرت اور علم چاہیے جو صرف عسکری صاحب ہی کے پاس تھا، لیکن اب غلام عباس کو شاید کسی حسن عسکری کی ضرورت بھی نہیں اور پھر خود غلام عباس کے اپنے ہی افسانوں کے بارے میں تاثرات اور توضیحات سے اور محمد حسن عسکری سمیت دیگر نقادوں کی آراء سے (خود اُن کی اپنی اپنی خواہش کے برعکس) یہ عیاں ہوا کہ غلام عباس کے افسانوں کی کوئی واضح معنوی سمت کا تعین اور ان کی موضوعاتی زُمرہ بندی ممکن نہیں اس لئے ان کے فن کی تفہیم کے لئے فکشن کی نئی مغربی شعریات سے استفادہ کرنا ہوگا جو ایک مشکل کام ہے لیکن اگر اُردو میں افسانے کی تنقید نے روایتی ڈگر سے ہٹ کر کوئی نیا اور روشن راستہ تلاش کرنا ہے تو پھر ہمارے نقادوں کو اس مشکل مرحلے سے بہر حال گزرنا ہوگا۔ یہاں ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ ہماری تنقید ماضی کی طرح مغربی تنقید کے کسی رجحان کا محض چربہ بن کر رہ جائے۔ نئی تنقیدی تھیوری میں ویسے بھی چربہ سازی ممکن نہیں کیوں کہ یہ چربہ ساز کا بھرم چند لمحوں ہی میں کھول کر رکھ دیتی ہے، اس میں نظریے سے زیادہ طریق کار (method) اہم ہے اور طریق کار کو سمجھے بغیر برتا نہیں جا سکتا؛ تنقید میں نئی تھیوری کے طریق کار کے اطلاق سے ہمارے ادب کی تفہیم کے جو نئے دریچے کھلیں گے ممکن ہے وہ ہمیں ہمارے اپنے ادبی و سماجی سیاق کے مطابق اس طریق کار میں توسیعات کے راستے سمجھا دیں بہر حال ہمیں آغاز تو اُمید پرستی کے ساتھ کرنا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ غلام عباس (انٹرویو) (۱۹ رجون ۱۹۸۱) روزنامہ حریت، کراچی

۲۔ Jeremy Hawthorn, "Studying the Novel" (1993) Edward Arnold, London P.104

۳۔ Booth, Wayne C. The Rhetoric of Fiction Penguin Books, London (1991) PP.71

۴۔ Booth, Wayne C. Ibid (1991) PP.73

۵۔ بحوالہ انٹرویو انجم رشید، روزنامہ حریت، کراچی، ۱۹ رجون ۱۹۸۱ء

۶۔ انٹرویو بشیر نیاز "۳۰ رجولائی ۱۹۶۱ء، نصرت، لاہور

۷۔ انجم رشید، بحوالہ سابقہ

۸۔ انٹرویو عقیل عباس جعفری (۲۷ نومبر ۱۹۸۱) حریت، کراچی

۹۔ غلام عباس انٹرویو تبسم عارف، روزنامہ جنگ، کراچی، ۲۷ راپریل ۱۹۸۱ء

۱۰۔ انٹرویو طاہر مسعود (۲۵ جون ۱۹۸۲) جسارت، کراچی

۱۱۔ غلام عباس (۱۹۶۱) ہم قلم، کراچی

۱۲۔ محمد حسن عسکری 'انسان اور آدمی' (۱۹۵۳) مکتبہ جدید، لاہور، ص ۲۱۰

۱۳۔ انتظار حسین 'اُردو کے تین افسانہ نگار' (جنوری ۱۹۵۰) ماہِ نو، کراچی

۱۴۔ عبدالجلیل "جاڑے کی چاندنی" (تبصرہ) غیر مطبوعہ، مسودہ راقم کے پاس موجود ہے

۱۵۔ نادیہ جلیل، "غلام عباس کی افسانہ نگاری" مقالہ برائے ایم اے اُردو، اورنٹیل کالج پنجاب یونیورسٹی، لاہور (۱۹۸۲/۸۳) غیر مطبوعہ، ص ۱۰۲

۱۶۔ شہزاد منظر غلام عباس بحیثیت افسانہ نگار' (جنوری فروری ۱۹۸۶) دو ماہی الفاظ، علی گڑھ

۱۷۔ جلال الدین احمد 'غلام عباس کی افسانہ نگاری' (فروری ۱۹۵۳) ص ۱۷، ماہِ نو، کراچی

۱۸۔ ن م راشد، تمہید 'جاڑے کی چاندنی' مکتبہ سجاد کامران، کراچی (۱۹۶۰/ اکتوبر ۱۹۸۰) ص ۹

۱۹۔ انٹرویو انجم رشید (۱۹ جون ۱۹۸۱) روزنامہ حریت، کراچی

۲۰۔ انٹرویو انجم رشید بحوالہ سابقہ

۲۱۔ انٹرویو طاہر مسعود، (۲۵ جون ۱۹۸۲) روزنامہ جسارت، کراچی

۲۲۔ محمد حسن عسکری 'انسان اور آدمی' (۱۹۵۳) مکتبہ جدید، لاہور (۱۹۵۳) ص ۲۱۳

۲۳۔ احمد ندیم قاسمی "غلام عباس — ایک بڑا افسانہ نگار" غیر مطبوعہ خود قاسمی صاحب کے عطا کردہ مضمون کا ٹائپ شدہ مسودہ راقم کے پاس موجود ہے۔

۲۴۔ جلال الدین احمد "غلام عباس کی افسانہ نگاری" (ماہِ نو، فروری ۱۹۵۳) کراچی، ص ۱۵

۲۵۔ ن م راشد، تمہید جاڑے کی چاندنی، ص ۱۵ (۱۹۸۰ء) مکتبہ سجاد کامران، کراچی

۲۶۔ انتظار حسین، "اُردو کے تین افسانہ نگار" ماہِ نو کراچی، جنوری ۱۹۵۰ ص ۲۲، ۲۵

۲۷۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، 'تحسین و تردید' (۱۹۹۵ء) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ص ۷۰، ۷۱

۲۸۔ فروغ احمد۔ غلام عباس: آزاد خیال، صاحب طرز قصہ گو افسانہ نگار (غیر مطبوعہ مسودہ راقم کے پاس موجود ہے)

۲۹۔ آفتاب احمد خاں، 'جاڑے کی چاندنی' سات رنگ اکتوبر ۱۹۶۰ء، ص ۶۰، کراچی

۳۰۔ ستار طاہر۔ جاڑے کی چاندنی۔ کتاب، لاہور، مارچ ۱۹۷۱ء، ص ۱۳

۳۱۔ ہربرٹ مارکیوزے، 'جمالیات کا ایک رُخ' ترجمہ مسرت انیس مقالہ برائے ایم اے اُردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان (۱۹۹۰) ص ۴۴

۳۲۔ انتظار حسین تبصرہ کن رس، روزنامہ مشرق (۱۹۷۰)، لاہور

۳۳۔ غلام عباس (۱۲ نومبر ۱۹۸۲) روزنامہ جنگ، کراچی

☆☆☆

(مشمولہ "بازیافت" لاہور، شمارہ نمبر ۱۵، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۹ء)

کتاب: غلام عباس: فکروفن

مرتب: ایم۔خالد فیاض

پہلی اشاعت: اپریل، 2010ء

ناشر: ذوالفقار احسن (03008704221)

سید خاور علی رضا (0307-6727312)

تعداد: پانچ سو

قیمت: 500 روپے

مطبع: فیض الاسلام پریس، راولپنڈی

رابطہ مرتب: فون: 0333-4284895

ای میل: fayyazkhalid35@yahoo.com

نقش گر پبلی کیشنز ○ راولپنڈی

naqshgar@yahoo.com

غلام عبّاس: فکر و فن

مرتب:
ایم۔ خالد فیّاض